گذشتہ صدی ھجری میں مسلم معاشرہ کے فکری رجحانات

پروفیسر محمد رفیق چوھان

مذھبی جذبہ کا اظہار مختلف ادوار میں مختلف انداز کا ھوتا ھے ۔ ھر مذھب میں مختلف النوع نکات اثر کی گنجائش ھوتی ھے اور اس کے ماننے والے کبھی ایک قسم کے نکات اثر کے تحت اپنے مذھب کی تعلیمات کی تعبیر کرتے ھیں تو کبھی دوسری قسم کے نکات اثر کے تحت ۔ مذھبی عقائد و اصطلاحات کی تعبیر و تفسیر کے اس اختلاف کی وجہ سے مختلف ادوار میں ایک ھی مذھب کے ماننے والوں کے میلانات، رجحانات اور رویوں میں بہت کچھ فرق واقع ھو جاتا ھے جس کا مشاھدہ زندگی کے متعلق ان کے عمومی رد عمل سے لگایا جا سکتا ھے ۔ چنانچہ ھم دیکھتے ھیں کہ کبھی تو مذھب کے زیر اثر ترک خودی، خود شکنی، فنا، تقدیر پرستی، بے عملی، جمود، رھبانیت اور توھم پرستی جیسے خیالات کو تقویت ملتی ھے تو کبھی مذھب کے زیر اثر ھی قوموں میں خودداری، عزت نفس، حرکت و عمل اور حقیقت پسندی جیسے رجحانات اپنے کمال کو پہنچتے ھیں، وہ حقیقت کے حرکی اور عملی پہلوؤں کو اپنے پیش نظر رکھتی ھیں، تقلید پرستی کی بجائے اجتہاد کو اپنا شعار بناتی ھیں اور فنا فی ذات باری کی بجائے فنا فی احکام باری کو اپنا مقصود بنا لیتی ھیں ۔

آج مسلم معاشرہ میں ایک خاص قسم کی بیداری اور خودشعوری کا مظاھرہ

دیکھنے میں آتا ہے ۔ مسلمان بحیثیت مجموعی اپنے نظریاتی تشخص کی بقا اور فروغ کے لئے کوشاں ہیں ۔ ان میں خود شناسی کا جذبہ اس طرح بیدار ہو گیا ہے کہ وہ وقت کی بڑی سے بڑی طاقت کو للکارنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ۔ اس صورت حال کا موازنہ بیسوی صدی کے اوائل کے حالات سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک بڑی اور بنیادی تبدیلی ہے ۔ یہ تبدیلی اچانک یا کسی شعوری کوشش کے بغیر محض تاریخی حادثات کے نتیجے میں رونما نہیں ہو گئی بلکہ اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کے اپنے عقائد و تصورات کی وہ تعبیر و تفسیر ہے جس کے نتیجہ میں زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں ان کا رد عمل اپنی پیشرو نسلوں سے بہت کچھ مختلف ہو گیا ہے ۔ وہ اپنے مذہب کو محض خدا اور بندے کے نجی تعلق تک محدود رکھنے کی بجائے اسے ایک دین یا نظام حیات کے طور پر معاشرے میں جاری و ساری کرنا چاہتے ہیں ۔ ایک طرف تو وہ ان تصورات اور تعبیرات کو ترک کر رہے ہیں یا ان کی اصلاح کر رہے ہیں جو ان کی اجتماعی زندگی کی پستی اور زبوں حالی کا سبب بنتے تھے اور دوسری طرف وہ ان تصورات اور تعبیرات کو اپنا رہے ہیں جن کی بدولت زندگی کے اجتماعی مسائل کے بارے میں ان کا رد عمل زیادہ مربوط اور موثر ہوتا جا رہا ہے ۔ اس تبدیلی کے لئے درد دل اور چشم بصیرت رکھنے والے علماء اور مفکرین ایک طویل عرصے تک جہاد کرتے رہے ہیں اور جہاد کا یہ عمل ابھی تک جاری ہے ۔ شروع میں یہ ہوا کہ ان حکماء نے ملت کے اجتماعی امراض کی جو تشخیص کی اور ان کے علاج کے لئے جو تجاویزپیش کیں وہ ایک طویل عرصے تک مسلمانوں سے بالعموم شرف قبولیت حاصل نہ کر سکیں ۔ لیکن جہد مسلسل اور پیہم کاوش کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہی باتیں جو کبھی انوکھی اور عجیب سی محسوس ہوتی تھیں اب بڑی

عام فہم اور مقبول عام ہو گئی ہیں - اس ضمن میں بہترین مثال غالباً شاہ ولی اللہ کی دی جا سکتی ہے - شاہ صاحب نے مسلمانوں میں تنگ نظری، فرقہوارانہ عصبیتوں اور تقلید جامد کی خرابیوں کو محسوس کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان خامیوں کا بنیادی سبب فقہی احکام کی تفسیر و تعبیر میں بے جا سختی اور شدت ہے - کیونکہ مسلمان اجتہاد سے بے گانہ ہو چکے ہیں - اپنی کتاب ''مصفی،، میں وہ لکھتے ہیں ''ہمارے زمانے کے سادہ لوگ اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں - اونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جارہے ہیں-،، تنگ نظری اور فرقہ وارانہ عصبیتوں سے بچنے کے لئے شاہ صاحب نے ضروری سمجھا کہ فقہی احکام کی تعبیر میں سختی اور شدت اختیار نہ کی جائے - انہوں نے تجویز کیا کہ مذہبی احکام کی تفسیر میں نرمی اختیار کی جانی چاہئے اور اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اسلامی احکام خدا کی بے قاعدہ مرضی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اللہ نے وہی کچھ حکم دیا ہے جو انسانوں کے لئے مفید ہے - وہ تعلیمات اسلامی کو عام کرنا بہت ضروری سمجھتے تھے - چنانچہ اس غرض سے کہ قرآنی تعلیمات اس دور کے عام خواندہ افراد تک پہنچیں انہوں نے بذات خود قرآن کا فارسی ترجمہ کیا جو غالباً برصغیر کی تاریخ میں قرآن کا پہلا فارسی ترجمہ تھا - یہ ایک جرأت مندانہ اقدام تھا - جسکے بڑے دور رس اثرات مترتب ہوئے - کیونکہ قرآن سے زیادہ انقلاب آفرین دنیا میں کوئی کتاب نہیں ہے - مشہور الجزائری لیڈر فرحت عباس نے اپنی کتاب '' The Night of Imperialism ،، میں واضح طور پر لکھا ہے کہ شمالی افریقہ کے ممالک مثلاً مراکش، الجزائر وغیرہ میں سماجی بیداری کا عمل صحیح معنوں میں اس دن سے شروع ہوا جب محمد عبدہ شمالی افریقہ آئے اور انہوں نے تفسیر قرآن کی تعلیم کو عام کیا -۱- شاہ

ولی اللہ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ میں بڑی وضاحت اور تفصیل سے اپنے دور کے معاشرے کے معاشی عدم توازن کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی۔ وہ ایسے تمام لوگوں کو استحصالی گروہ میں شمار کرتے ھیں جو معاشرہ کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتے لیکن نام نہاد پیدائشی یا طبقاتی مراعات کی بنا پر مالیات عامہ پر بوجھ بنے ھوں۔ معاشرہ کی یہ حالت نہایت نقصان دہ ھے کہ کچھ لوگ تو عیش و عشرت کے تمام وسائل پر متصرف ھوں جبکہ دوسرے لوگ جسم و روح کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے بھی جانوروں کی طرح مشقت کرنے پر مجبور ھوں جس کی وجہ سے ان کی بہت سی معاشرتی خوبیاں ختم ھوجاتی ھیں۔ شاہ صاحب نے حکام کی ذمہ داریاں بھی گنوائی ھیں ۔ حکام اور باختیار افراد کا کام یہ نہیں ھے کہ رعیت کی خون پسینے کی کمائی پر عیش کریں اور لذائذ دنیا میں گم ھو جائیں ۔ ان کا فرض اس کے برعکس یہ ھے کہ شریعت کو نافذ کریں، اور اوامر و نواھی کی ترویج کریں، اور سچے اسلامی جذبہ جہاد کو عام کریں ۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں مسلم معاشرے کے ھمہ پہلو انحطاط کے پس منظر میں شاہ صاحب کے یہ خیالات اور ارشادات نہایت انقلابی، حیات افروز اور ترقی پسندانہ تھے ۔ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ''انھوں نے قوم کے اندر ایسی امنگیں پیدا کر دیں جنھوں نے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے اخلاقی ذوق و شوق میں سے کچھ دوبارہ واپس لے لے اور اپنے عقائد کی پاکی کو باقی رکھ سکے ۔ قوم کے ضمیر، اس کے عقائد اور اس کے اخلاقی مقصد پر اس کے ایقان کو اٹھارویں صدی کے ملبے میں سے باھر نکال لینا بذات خود کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا، مگر شاہ ولی اللہ نے اس سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اپنی تصانیف کے ذریعے انھوں نے مسلم فکر کے بہت سے میدانوں میں بڑے دیرپا اضافے کئے''۲ ۔ شاہ ولی اللہ

کے مشن کو ان کے بعد آنے والوں نے آگے بڑھایا اور آج صورت حال یہ ہے کہ ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی معاشی مسئلہ کو جائز اہمیت دے رہی ہے ، ذمہ دار حکومتوں کے قیام کے لئے کوشاں ہے، اور فرقہ وارانہ تعصبات اور تنگ نظری اگرچہ اب بھی ختم تو نہیں ہوئی تاہم اتنا زور بھی اب اس کا نہیں رہا جتنا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔

مسلمانوں کی اجتماعی پستی اور زبوں حالی کے بے شمار اسباب میں سے اکثر و بیشتر کو ایک عنوان کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے وحدت الوجودی تصوف۔ وہی نظریہ وحدت الوجود جسے ولیم جیمز اخلاقی تعطل قرار دیتا ہے اور شوپنہار جسے الحاد کی شاعری کہتا ہے، جب مسلمانوں میں تصوف کے نام سے در آیا تو اس کے نتیجہ میں بالکل غیر اسلامی بلکہ بہت سے خلاف اسلام نظریات و خیالات اور میلانات نے مسلمانوں میں جڑ پکڑ لی۔ خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں کہ بعض صوفیوں نے اپنا کلمہ بھی عام مسلمانوں سے الگ کرلیا۔ مسلمان کہتے تھے ''لا الہ الا اللہ،، بعض صوفی کہنے لگے ''لا موجود الا اللہ،، یا ''لا موثر فی الوجود الا اللہ،، اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں اور ہر وجود میں جو موثر حقیقت ہے وہ خدا ہی ہے ۳۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کے سوا اور کوئی موجود نہیں تو عابد و معبود، خالق و مخلوق کا فرق ختم ہو جاتا ہے اور عبادت و پرستش اور اطاعت کے مفہوم کو ضعف پہنچنا لازمی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے شمار صوفیوں نے واضح طور پر اور کھلم کھلا شریعت کے مقرر کردہ اوامر و نواہی کی نفی کی ہے۔ شریعت کے مقابلے میں طریقت کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ بہت سوں نے طریقت کے مقابلے میں شریعت کو سرے

سے فضول اور غیر ضروری قرار دیا اور دینی احکام کو عملاً منسوخ کر دیا۔ اور جواز اس کا یہ پیش کیا کہ فنا فی ذات باری تعالی ھی سب سے بڑی سعادت اور نیکی ھے ۔ حالانکہ جیسا کہ اقبال کہتے ھیں اسلام کا مطالبہ اپنے ماننے والوں سے فنا فی احکام باری تعالی ھے نہ کہ فنا فی ذات باری تعالی۔ ویسے بھی غور طلب بات یہ ھے کہ اجتماعی زندگی کو بطریق احسن گزارنے، اس میں نظم و ترتیب پیدا کرنے، اور معاشرے کی اجتماعی قوت کو نیکی کی سر بلندی اور بدی کی بیخ کنی کے لئے صرف کرنے کے لئے ضروری ھے کہ ملت کسی آئین اجتماعی کی پابند ھو اور یہ آئین اجتماعی ھمیں شریعت سے ھی مل سکتا ھے، صوفیانہ طریقت سے نہیں۔

راسخ العقیدگی کو اس طور نقصان پہنچانے کے علاوہ اس تصوف نے مسلمانوں کو ایک بڑا نقصان یہ پہنچایا کہ اس دنیا کو اور اس دنیا میں گزرنے والی زندگی کو ناقابل اعتنا قرار دیا ۔ سائنسی اور حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی بجائے لوگوں کو صرف مراقبوں، مکاشفوں اور نام نہاد چلہ کشی اور وظائف و عملیات کا گرویدہ بنا دیا، جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ قوم نہ صرف بے عملی کا شکار ھوگئی بلکہ بقول مولانا مودودی اس دنیا کو دارالعمل یا دارالامتحان کی بجائے دارالعذاب اور ''مایا،، کا جال تصور کرنے لگ گئی۔ مسلمان اس بات کو بھول گئے کہ وہ دنیا میں خدا کے نائب کی حیثیت سے مامور ھیں۔ ۴ ۔ اور انہیں اس دنیا میں خدا کے پسندیدہ دین اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے انفرادی اور اجتماعی ھر دو سطح پر نافذ کرنا ھے ۔ اس تصوف نے مسلمانوں میں دین و دنیا کی علیحدگی کا تصور پیدا کیا ۔ جس کا نقصان مسلم معاشرہ کو یہ پہنچا

کہ معاشرتی معاملات میں شریر اور شر پسند افراد کو من مانی کرنے اور فتنہ و فساد پھیلانے کی کھلی چھٹی مل گئی ۔ اسی نظریہ کی بدولت عوام پر یہ اثر پڑا کہ وہ حکام کے جبر و تشدد اور ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے کے قابل نہ رہے ۔ ان کے ذہنوں میں یہ غلط خیال بیٹھ گیا کہ اگر وہ معاشی یا معاشرتی ناانصافی کا شکار ہو بھی رہے ہیں تو یہ اس لئے ہے کہ خدا ایسا چاہتا ہے اور یہ کہ انھیں اس ظلم و ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس ظلم و ناانصافی کو سہنے کے صلے میں خدا آخرت میں ان کے مرتبے بلند کرے گا اور جنت کی نعمتوں سے سرفراز کرے گا ۔ مذہب کا یہی وہ غلط تصور ہے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذہب کے مخالفین مذہب کو افیون قرار دیتے ہیں ۔ قابل افسوس ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بات شاید قدرے باعث تفنن بھی ہو کہ اس تصور کو مزید تقویت دینے کے لئے چودھویں صدی ھجری کے اوائل میں یہ خیال بھی لوگوں کے ذھن میں بیٹھ گیا تھا کہ ان ظالم اور بدکار لوگوں کو جتنا بھی یہ ظلم و استحصال کرنا چاھیں کر لینے دو، اس لئے کہ بس اب قیامت تو آنے ھی والی ھے، چودھویں صدی ھجری قیامت کی صدی ھے، اس کے بعد اگلی صدی تو کوئی ھے ھی نہیں ۔ ترک دنیا اور عزلت نشینی کا رجحان بھی مسلمانوں میں مقبول ھوا حالانکہ پیغمبر اسلام اور ان کے صحابہ کرام اپنی تمامتر روحانی رفعتوں کے باوجود کبھی اپنے دنیاوی فرائض سے غافل نہ ھوئے تھے ۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ھوتا ھے کہ شاید مسلمانوں میں رھبانیت کے رجحانات اور میلانات کو انھی لوگوں نے فروغ دیا جنھیں دین اسلام اور مسلمانوں کی سر بلندی ناگوار گزرتی تھی ۔

تصوف کے پردے میں درآمد شدہ غیر اسلامی نظریات و میلانات کی تردید اگرچہ ہر دور میں راسخ العقیدہ صوفیا کرتے رہے ہیں لیکن واضح اور قاطع علمی انداز میں سب سے پہلے شیخ احمد سر ہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی نے وحدت الوجود کو رد کیا۔ انھوں نے اپنے باطنی شعور اور مشاہدے کی بنا پر یہ حقیقت جان لی کہ وحدت الوجود کا وجدان روحانی ''سکر،، کی حالت میں ہوتا ہے مگر حقیقت کا عکاس نہیں ہوتا۔ اسلامی تعلیمات کے نقطہ نگاہ سے مجدد الف ثانی کی یہ ایک نہایت عظیم اورقابل قدر خدمت ہے کہ انھوں نے وجدانی یا صوفیانہ مشاہدہ کو فی نفسہ معیار حقیقت تسلیم کرنے کو ایک غلطی قرار دیا کیونکہ وجدانی مشاہدہ تو غلط بھی ہو سکتا ہے، صرف وحی الہی غلطیوں کے امکان سے مبرا ہو سکتی ہے۔ چونکہ رسول اکرمؐ وحی سے ہدایت۔ یافتہ تھے اور خدا باطل سے ان کی حفاظت کرتا تھا لہذا جو مشاہدہ آنحضرت کی ہدایت و تعلیمات کے خلاف ہو اسے ''سکر،، کا نتیجہ قرار دیا جانا چاہئے-ہ - اقبال نے بھی وحدت الوجود کے نظریہ پر اپنی تحریروں میں بارہا تنقید کی ہے۔ امرتسر کے اخبار ''وکیل،، میں ''اسرار خودی اور تصوف،، کے زیر عنوان وہ لکھتے ہیں ''میرا مذہب یہ ہے کہ خدائے تعالی نظام عالم میں جاری و ساری نہیں بلکہ نظام عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے جب وہ چاہے گا اس کا خاتمہ ہو جائے گا،، اقبال شریعت و طریقت اور ظاہر و باطن کے امتیاز کو بنیاد بنا کر شرعی حدود سے بے نیازی برتنے کے رجحان کے بھی مخالف تھے۔ مولوی سراج الدین پال ایڈوکیٹ کو ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ ''حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معنی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو منسوخ

کرنا ہے،،۔

اسی طرح مسلمانوں نے دین و دنیا کی علیحدگی کے اس تصور سے بھی بالعموم نجات حاصل کرلی ہے جس کے ماتحت دنیاوی معاملات کو ھیچ اور گھٹیا سمجھا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دنیاوی معاملات سے دین دار افراد کا کوئی تعلق نہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ روز بروز مسلم عوام کے ذھن میں یہ تصور تقویت حاصل کرتا جا رہا ہے کہ اسلام دین و دنیا کی علیحدگی ہرگز نہیں چاھتا بلکہ وہ ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسان کے روحانی اور دنیاوی دونوں پہلوؤں کے بارےمیں ھدایات فراھم کرتا ہے اور اپنے پیرو کاروں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ صرف اپنی نجی زندگی ھی میں نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں بھی اسلام کے نفاذ کے لئے مقدور بھر کوشش کریں گے ''اسلام کا نظریہ حیات،، نامی کتاب میں خلیفہ عبدالحکیم کہتے ھیں ''باطن کی آسمانی سلطنت کو خارج کی آسمانی سلطنت میں متشکل کرنا چاھئے تاکہ انسان کی منظم زندگی محبت، اخوت اور انصاف پر مبنی ھو سکے۔ اگر خدا کے نیک بندے انسان کی معاشری اور سیاسی زندگی کو اپنے حال پر تنہا چھوڑدیں تو معاشری اور معاشی خرابیوں کے سبب نیک افراد کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ ''اگر معاشرہ میں چند آدمی برائی کرتے ھوں اور دوسرے ان کو روکنے کے لئے کچھ نہ کرتے ھوں تو نیک اور بد سب کے سب تباھی میں گھر جائیں گے کیونکہ نیکوکار محض خاموش تماشائی بنے رہے اور برائی کو روکنے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا،،۶۔ دین اسلام صرف فرد اور خدا کے مابین نجی تعلق کا نام ھی نہیں ہے بلکہ اجتماعی اور معاشرتی

سطح پر بھی زندگی بسر کرنے کا لائحہ عمل تجویز کرتا ہے ۔ اور اسلام کے معاشرتی نظام کو اپنائے بغیر ہم دین اسلام کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا نہیں کر سکتے ۔ ''قرآن نے حیات اور حق کی معرفت کو اس مبارک درخت کے مثل قرار دیا جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہوں اور جس کی شاخیں آسمان سے ہمکنار ہوں ۔ کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء ۔ تصوریت اور حقائق پسندی کا امتزاج اس سے بہتر ممکن نہیں ہے ۔ اس امتزاج میں کائنات کے ٹھوس اور محسوس حقائق اور انسانی ذہن و روح کے لطائف و تصرفات دونوں کی سمائی ہوگئی''۔۷ ڈاکٹر علی شریعتی کہتے ہیں کہ اسلام کے نقطہ نظر سے مثالی انسان وہ ہے جو ''فطرت کی طرف سے بے اعتنائی نہیں برتتا اور نہ ہی بنی نوع انسان سے منہ موڑتا ہے ۔ وہ اپنے ہاتھ میں قیصر کی تلوار اور سینے میں مسیح کا دل رکھتا ہے ۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو سائنس کے حسن کو بھی سمجھتا ہے اور خدا کے حسن کو بھی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا فلسفیانہ خیال اسے نوع انسانی کی قسمت سے بے پروا نہیں کرتا''۔۸

اسلام کا سب سے اہم تصور توحید خداوندی کا تصور ہے ۔ اسلام کے دور آغاز اور دور عروج میں مسلمانوں کی سر بلندی اور سرفرازی میں سب سے بڑا ہاتھ اسی تصورتوحید کا تھا ۔ بدقسمتی سے جب مسلمانوں میں حرکت و ترقی کی قوتوں کو ضعف پہنچنا شروع ہوا تو اس تصور توحید نے بھی آہستہ آہستہ اپنا رنگ تبدیل کرنا شروع کیا یہاں تک کہ تصور توحید کو نظریہ وحدت الوجود کے مترادف سمجھ لیا گیا ۔ اقبال نے اسی صورت حال کا ماتم کرتے ہوئے کہا ہے ۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے ؟ فقط اک مسئلہ علم کلام ۹

مولانا حنیف ندوی نے اپنی کتاب اساسیات اسلام میں خوب کہا ہے کہ ''اسلامی نقطہ نظر سے یہ عقیدہ (توحید) نہ خشک منطقی اذعان کا نام ہے اور نہ اسے کسی بھی صورت میں محض تحکم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک فعال اور حد درجہ انقلابی عنصر ہے جس کو مان لینے کے بعد عمل و سیرت کا نقشہ بالکل بدل جاتا ہے۔ یہ ایک قوت کا نام ہے''۔۱ ۔ تصور توحید کی تفسیر و تعبیر اور اس کے معانی و مفاہیم کے تعین کے لئے ماضی قریب میں بہت سے لوگوں نے کام کیا ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اصطلاحاً فلسفی کہلاتے ہیں اور وہ بھی جنہیں اصطلاحاً فلسفی تو نہیں کہا جاتا البتہ وہ علمائے دین کے طبقے میں شامل ہوتے ہیں۔ یوں فلسفہ اور مذہب کے تعلق کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس تعلق کے چار ادوار رہے ہیں۔ پہلے دور میں فلسفہ اور مذہب ہم معنی تھے۔ دوسرے دور میں مذہب نے فلسفہ کو اپنے خادم کے طور پر استعمال کیا، یعنی فلسفے نے مذہب کے دفاع کا فریضہ انجام دیا۔ تیسرے دور میں مذہب اور فلسفہ ایک دوسرے کی ضد بن گئے۔ اور اب چوتھے دور میں فلسفہ کا کام نہ تو مذہب تراشی ہے، نہ یہ کہ مذہب کے حق میں دلائل پیش کرے، اور نہ ہی یہ کہ فلسفہ مذہبی حقائق اور تصورات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرے، بلکہ فلسفہ کا کام یہ ہے کہ مذہبی عقائد و تصورات کا تجزیہ کرے اور ان کے مفاہیم کا تعین کرے۔ اس آخری نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو تصور توحید سے متعلق فلسفی اور غیر فلسفی دونوں قسم کے علماء نے ماضی قریب میں خاصی پیش رفت کی ہے جس کے نتیجہ میں اب مسلمان توحید کی اس تعبیر کو زیادہ اپنا رہے ہیں کہ چونکہ فطرت اور انسان ایک ہی نظام ربوبیت کا حصہ ہیں لہذا انسان کا کام یہ ہے کہ وہ مظاہر فطرت کا حقیقت

پسندانه مطالعه کرے، توهم پرستی کو ترک کرے، اور سائنسی اور علمی رجحان و اسلوب فکر و عمل کو اختیار کرے۔ اجتماعی زندگی کے نقطه نگاہ سے توحید کا سب سے قابل قدر اور مفید تصور جو روز بروز مسلم دنیا میں قوت پکڑتا جا رھا ھے یه ھے که حاکمیت اعلی کسی حاکم وقت یا بادشاہ کو نهیں بلکه خدا کو حاصل ھے۔ بظاهر یه محسوس هوتا ھے که خدا کی حاکمیت کا تصور بعض مذهبی جماعتوں نے اپنی بالادستی کی خاطر وضع کیا ھے۔ کیونکه خدا کسی حاکم فانی کی طرح بذات خود تو محسوس طور پر انسانوں کے اجتماعی معاملات پر اثر انداز هوتا بظاهر نظر نهیں آتا۔ تاهم اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو دراصل یه قانون شریعت کی بالادستی کا تصور ھے۔ اگر قانون و سیاسیات کی جدید اصطلاح میں بات کریں تو اسکا مطلب یه ھے که انتظامیه قانون یعنی شریعت سے ماورا نهیں ھے۔ شریعت کا اطلاق حکام اور رعایا دونوں پر یکساں هوتا ھے۔ اور حکام کسی طور غیر منصفانه اور شریعت سے متصادم قوانین کو معاشرے میں نافذ کرنے کے مجاز نهیں هیں۔ یه تصور ظلم کو برداشت کرنے اور اس سے مصالحت پر آماده هونے کے رجحان کی بھی حوصله شکنی کرتا ھے۔ کیونکه "بلاتعرض شر کو برداشت کرنا ایسا هی ھے جیسا که خود شر کا ارتکاب کرنا۔ غلامانه طور پر ظلم کو برداشت کرنے والے هی ظالموں کی پرورش کرتے هیں"۱۱۔ اس تصور کا نتیجه یه هوا که ایک طرف تو مسلمان معاشی، سیاسی اور هر قسم کے سماجی استحصال اور ظلم و نا انصافی کے خلاف اب عملی طور پر جدوجهد کر رهے هیں۔ اخوت، مساوات اور آزادی کے لئے کوشاں هیں۔ اور اس سلسلے میں وه هر قسم کے استعمار اور سامراج سے نبرد آزما هو رهے هیں۔ اور دوسری طرف ان کے دلوں میں یه آرزو بڑی شدت سے فروغ پارهی ھے که ان کے اجتماعی معاملات میں

قوانین شرعیه کا نفاذ ہو۔ اللہ تعالی کی حاکمیت مطلق کے تصور کو مولانا مودودی کی بلند پایه تصنیف ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں،، میں بڑے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے قرآن پاک میں استعمال ہونے والی چار اصطلاحوں یعنی الہ، رب، دین اور عبادت کی لغوی تحقیق کی ہے۔ عربی زبان میں ان الفاظ کے استعمال کے مختلف انداز بیان کئے ہیں۔ پھر قرآن پاک میں مختلف مقامات پر جس جس سیاق و سباق میں انہیں استعمال کیا گیا ہے اس کی تاریخ اور تفسیری تشریح کے بعد قاری کو ان نتائج تک پہنچایا ہے کہ خدا ہی وہ واحد مقتدر مطلق ہے جو ہر قسم کی حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی امداد و اعانت، خبر گیری اور حفاظت کرتا ہے۔ اصل حاکم اور شارع وہی ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے کا مستقل بالذات حاکم اور آزاد و خود مختار قانون ساز ہونا غلط ہے۔ اس کے حکم کی سند کے بغیر کسی دوسرے کا حکم واجب الاطاعت نہیں-۱۲۔ وہی کائنات کا سلطان مطلق اور تمام جہان کا پرور دگار اور مربی ہے۔ ہر چیز کا مالک آقا اور فرماں روا وہی ہے۔ اور تمام مخلوقات کی بندگی اطاعت اور پرستش کا وہی مستحق ہے۔ ۱۳۔ طاغوت سے مراد ہر وہ ریاست و اقتدار اور ہر وہ رہنمائی و پیشوائی ہے جو خدا سے باغی ہو کر خدا کی زمین پر اپنا حکم چلائے اور اس کے بندوں کو زور و جبر سے یا تحریص و اطماع سے یا گمراہ کن تعلیمات سے اپنا تابع امر بنائے۔ ایسے ہر اقتدار اور ایسی ہر پیشوائی کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور اس کی بندگی اختیار کر کے اس کا حکم بجالانا دراصل طاغوت کی عبادت ہے۔ اور یہ کہ دین سے پورا نظام زندگی اپنے اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کو اس وقت تک باطل سے نبرد آزما رہنا ہے جب تک فتنہ یعنی ان نظامات کا وجود دنیا سے نہ مٹ جائے جن کی بنیاد خدا

سے بغاوت پر قائم ہے ۔ اور جب تک کہ پورا نظام اطاعت و بندگی اللہ کے لئے خالص نہ ہوجائے ۔۴۱

مغربی استعمار کے رد عمل میں جدید علوم سے مخاصمت محض کا جو رجحان ابتداءً مسلمانوں میں پیدا ہوا تھا، اب وہ ختم ہورہا ہے ۔ نہ صرف سائنسی اور تکنیکی علوم بلکہ جدید نفسیات، قانون، معاشیات، سیاسیات غرض تمام علوم عقلیہ میں مہارت کو اسلامی نہضت کے لئے باعث تنویت سمجھا جاتا ہے ۔ ایک لحاظ سے تو انہی جدید علوم کے حامل افراد سے قیادت کی بھی توقع کی جاتی ہے ۔ مولانا مودودی کہتے ہیں ''اس وقت کام کا اصل موقع ان لوگوں کے کے لئے ہے جنہوں نے ایک طرف مغربی تعلیم پائی ہے اور دوسری طرف جن کے دلوں میں خدا اور رسول اور قرآن اور آخرت پر ایمان محفوظ ہے ۔ قدیم طرز کی دینی تعلیم پائے ہوئے لوگ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اور علم دین کے لحاظ سے ان کے بہترین مددگار بن سکتے ہیں، مگر بدقسمتی سے وہ ان صلاحیتوں کے حامل نہیں ہیں جو قیادت اور زمام کار سنبھالنے کے لئے درکار ہیں، یہ صلاحیتیں فی‌الحال صرف مقدم الذکر گروہ ہی میں پائی جاتی ہیں، اور ضرورت ہے کہ اس وقت یہی گروہ آگے بڑھ کر کام کرے''۵۱ ۔ علمائے دین کی سوچ میں یہ تبدیلی نہایت خوش آئند ہے اور اس کا مسلم معاشرہ پر یہ مثبت اثر پڑا ہے کہ احیائے اسلامی کی تحریکوں کے کارکن اب کسی مخصوص شعبے سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد ان تحریکوں کے دست و بازو کا کردار انجام دے رہے ہیں ۔

حوالہ جات

۱ - Ali Shariati ; On the Sociology of Islam; Berkeley, 1979 p. 63

۲ - ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی - برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، اردو ترجمہ از ہلال احمد زبیری، کراچی، ۱۹٦۷ - ص ۲۴۷

۳ - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم - حکمت رومی - لاہور، ۱۹۵۵، ص ۱۰۷

۴ - مودودی، ابوالاعلی، تجدید و احیائے دین، لاہور، ۱۹٦٦ء ص ۲۵

۵ - سر ہندی، شیخ احمد، مکتوبات امام ربانی، لکھنو ۱۹۱۳ء جلد اول ص ۳۷۵

٦ - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم - اسلام کا نظریہ حیات - اردو ترجمہ از قطب الدین احمد - لاہور ۱۹۵۷ء ص ۲۹۵

۷ - ڈاکٹر یوسف حسین - روح اقبال - طبع پنجم ۱۹٦۲، ص ۱۷٦

۸ - Ali Shariati: op. cit., p. 122

۹ - اقبال - ضرب کلیم - لاہور، ص ۱۸

۱۰ - محمد حنیف ندوی - اساسیات اسلام - لاہور، ۱۹۷۳، ص ۵۷

۱۱ - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم - اسلام کا نظریہ حیات - ص ۲۹۴

۱۲ - مودودی - قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، لاہور، ۱۹٦۱، ص ۳۸، ۴۱

۱۳ - ایضاً - ص ۱۱۵

۱۴ - ایضاً - ص ۱۵۹

۱۵ - مودودی، تفہیمات حصہ سوم، لاہور ۱۹٦۹، ص ۳٦۰